مسلمانوں کی ترقی کے اہم اور بنیادی اَسباب

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے بہت سے حساس قسم کے داخلی اور خارجی مسائل کو لے کر پورے عالم اسلام میں، بالخصوص ہمارے ملک میں جو اِضطراب، بے چینی؛ بلکہ کسی حد تک بے بسی، مایوسی، اور احساسِ کمتری کی کیفیت پائی جاتی ہے، اُس کے علاج اور سدّ باب کے لیے مختلف مشورے، اور طرح طرح کی کوششیں سامنے آتی رہتی ہیں، جن میں سے بعض کے کچھ نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

یہاں یہ بات نہایت ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کی ہے کہ:

اِجتماعی طور پر مسلمانوں (خاص طور پر اہل السنۃ والجماعۃ) کو درپیش اِن حالات کا سامنا کیا وطنیت، علاقائیت، قومیت، حکومت وسلطنت، کاروباری مفادات، دہشت گردی وغیرہ کی بنا پر ہے؟ یا اِن کا منشا کچھ اور ہے؟

اگر وطنیت وعلاقائیت کی وجہ سے اِن حالات کا سامنا ہے تو پھر اُن ممالک میں کیوں یہ مشکلات ہیں جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا وطن اور ان ہی کا علاقہ ہیں؟ بلکہ جہاں اُن کی اپنی حکومتیں بھی ہیں؟

اگر صرف قومیت بنیاد ہے تو ''قومِ مسلم'' ہی کی طرف منسوب اُن فرقوں اور جماعتوں پر یہ ''نظریں'' کیوں نہیں ہیں جو اِسلام کے معہود ومتوارث تصور کو بدلنے کی عالمی مہم اور کوششوں کا حصہ بنی ہوئی ہیں؟

اگر حکومت وسلطنت کا مسئلہ ہے تو صرف مخصوص طرز کی مسلم حکومتوں ہی سے یہ کشمکش کیوں؟ دنیا میں اور بھی مذاہب ہیں، اور مذہبی بنیادوں پر اُن کی حکومتیں بھی ہیں، اُن سے یہ عداوت اور دشمنی کا اظہار کیوں نہیں؟

اگر کاروباری مفادات کا مسئلہ ہے تو کون سا مسلمان فرد، یا مسلمان حکومت کسی کے کاروبار میں مخل ہوتی ہے؟ بلکہ اگر تجزیہ کیا جائے تو شاید عالمی تجارت میں مسلمان ملکوں ہی کے قدرتی ذخائر اور وسائل کی سب سے بڑی شرکت اور تعاون ہے۔

اگر مسئلہ دہشت گردی اور شدت پسندی کا ہے تو اِس کا معیار کیا ہے؟ دوسروں کے اندرونی مسائل میں دخل دینا، پھر ملک پر ہی قبضہ کرلینا؛ یہ دہشت گردی کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں؟ پھر اِس دخل اندازی کے لیے دوہرا معیار اپنانا، کہ اگر ظالم حکمراں غیر مسلم ہو، یا طاقتور ممالک کا حلیف سمجھا جاتا ہو تو مسئلے کو آخری حد تک نظر انداز کرتے رہنا، اور اگر مسلم ہو تو فرضی مقدمات قائم کر کے بھی اُس کا مؤاخذہ کرلینا، یہ سب دہشت گردی سے متعلق عالمی ضابطۂ اخلاق کے اور انسانیت نوازی کے کس اصول کے تحت آتا ہے؟!

یہ عجیب وغریب صورتِ حال ہے کہ مسلمان ہی دہشت گرد بھی ہیں! پھر اُن کی دہشت کا نشانہ بھی مسلمان ہی بن رہے ہیں!! اور پھر اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر مداخلت کرنے والے بھی مسلمانوں ہی پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں!! عراق، افغان، فلسطین، شام، چین، برما وغیرہ میں اِس کھلے ہوئے دجل وفریب کا ایک طویل سلسلہ عرصہ سے جاری ہے، اور ''انسانیت'' ہے کہ خاموش ہے!!۔

اصل بات یہ ہے کہ عداوت ودشمنی کے یہ حالات مذکورہ بالا وجوہ کی بنیاد پر ہیں ہی نہیں، بلکہ اِن سب کا منشا:

۱- مسلمانوں کا عقیدۂ توحید ہے، جو تمام دجالی اسباب، اور طاغوتی قوتوں کے اِنکار کو مستلزم ہے: {**قد تبين الرشد من الغي، فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لا انفصام لها، والله سميع عليم**} [البقرة:۲۵۶] (ہدایت گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے، تو اب جو شخص طاغوت کا اِنکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے یقینا ایسا مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو چھوٹ نہیں سکتا، اور اللہ تعالیٰ ہمہ وقت سننے والے، اور ہر بات جاننے والے ہیں)۔

۲- مسلمانوں کا عقیدۂ ختمِ نبوت اور رسالتِ محمدی (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کا اقرار ہے، جو اللہ کے ہاں تقرب اور آخرت کی نجات کے لیے، اسلام کے علاوہ دیگر تمام تہذیبوں سے، اور گذشتہ، موجودہ اور آئندہ تمام شریعتوں سے صاف صاف دست برداری کا مطالبہ کرتا ہے: {ثم جعلناک علی شریعة من الأمر فاتبعها، ولا تتبع أهواء الذين لا يعلمون} [الجاثية: ۱۸] (پھر ہم نے آپ کو ایک خاص شریعت پر رکھا ہے تو آپ بس اسی کا اتباع کیجیے، اور نادانوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے)۔

اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے: {إن الدين عند الله الإسلام} [آل عمران: ۱۹] (اللہ کے نزدیک معتبر دِین تو بس اِسلام ہے)، اور یہ وضاحت بھی ہے کہ: {ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه} [آل عمران:۸۵] (جو اِسلام کے علاوہ کوئی اور دِین اِختیار کرے گا تو اُس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا)، حدیث شریف میں ہے کہ کوئی معمولی عمل بھی اگر شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہوا تو وہ اللہ کی بارگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوگا: "من عمل عملاً ليس عليه أمرنا فهو ردٌّ" [مسلم: ۱۷۱۸]۔

۳- مسلمانوں کا عقیدۂ اِیمان بالغیب اور آخرت بھی، اُن کے تئیں پائے جانے والے بغض وعداوت کی اہم بنیادوں میں سے ہے، جو سائنس اور مادیت کے اِس دور میں روحانیت وتوکل کی اہمیت کا، اور اسباب وتدابیر کی بے مائیگی اور بے ثباتی کا درس دیتا ہے، قرآن کریم صاف کہتا ہے: {لا يغرنک تقلّب الذين كفروا في البلاد، متاع قليل، ثم مأواهم جهنم} [آل عمران:۱۹۶] (آپ کو دھوکہ میں نہ ڈالدے کافروں کا ملکوں میں دندناتے پھرنا، یہ تو بس تھوڑا سا مزا ہے، پھر اِن کا ٹھکانہ جہنم ہے)۔

{والذين كفروا يتمتعون ويأكلون كما تأكل الأنعام، والنار مثوى لهم} [سورۃ محمد: ۱۲] (اور جنھوں نے کفر اَپنا لیا ہے وہ (دنیا میں) مزے اُڑاتے ہیں اور اِس طرح کھاتے ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں، مگر آئندہ اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔

ایک دوسری جگہ تو یہ مضمون خوب ہی واضح کردیا گیا ہے:{**ولولا أن يكون الناس أمةً واحدةً لجعلنا لمن يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفاً من فضة ومعارج عليها يظهرون، ولبيوتهم أبواباً وسرراً عليها يتكئون، وزخرفاً، وإن كل ذلك لما متاع الحيوٰة الدنيا، والآخرة عند ربك للمتقين**} [الزخرف:۳۳-۳۵] (اور اگر اِس کا خیال نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقہ کے (کافر اور دنیا کے طالب) ہوجائیں گے تو ہم کافروں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کردیتے، اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں، اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت (ومسہریاں) بھی جن پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، اور سونے کی بھی (کردیتے)، اور حقیقت میں یہ سب چیزیں (مختصرسی) دنیوی زندگی کا (بےوقعت سا) سامان ہیں، اور آخرت (جہاں کی ہر چیز دائمی ہے) آپ کے رب کے نزدیک تقوی والوں کے خاص ہے)۔

یعنی اللہ کے یہاں اِس دنیوی مال و دولت کی کوئی قدر نہیں، نہ اس کا دِیا جانا اللہ کے یہاں قرب ووجاہت، یا ترقی ومقبولیت کی کوئی دلیل ہے، اور نہ اُس کا نہ دیا جانا ذلت ونِکبت، یا پستی ومحرومی کی کوئی علامت ہے، یہ تو ایسی بے قدر چیز ہے کہ اگر اوپر درج مصلحت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ سب چیزیں صرف کافروں ہی کو دیتے، ایمان والوں کو دنیا کی زیب وزینت اور عیش پسندی کی اجازت ہی نہ دیتے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ ہم ایک سچے پکے مسلمان رہتے ہوئے غیروں کو خوش کر ہی نہیں سکتے، حق وباطل کی یہ آویزش، اولیاء الرحمن اور اولیاء الشیطان کی یہ چپقلش تخلیقِ آدم کے وقت سے ہے، اور قیامت تک یونہی جاری رہے گی:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز		چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:{**ولن تَرضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم، قل إن هدى الله هو الهدى، ولئن اتبعت أهوائهم بعد الذي جاءك من العلم مالك من الله من ولي ولا نصير**} [البقرة:۱۲۰]۔

(اور آپ سے یہود و نصاری ہرگز مطمئن نہیں ہوں گے جب تک آپ اُن کے مذہب کو نہ اختیار کرلیں، آپ فرمادیں کہ بے شک اللہ کی رہنمائی ہی اصل رہنمائی ہے — لہٰذا مجھے بس وہی اختیار کرنی ہے —، اور اگر آپ نے اُن کی خواہشات پوری کرنے کی فکر فرمائی تو اللہ کے مقابلے میں پھر آپ کو نہ کوئی دوست ملے گا، اور نہ ہی کوئی مددگار)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: {**ودّوا لو تكفرون كما كفروا فتكونون سواءً، فلا تتخذوا منهم أولياء حتى يهاجروا في سبيل الله**} [النساء: ۸۹] (یہ کافر لوگ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر کرنے لگو جیسا کہ وہ کفر کرتے ہیں، تاکہ تم سب ایک جیسے ہوجاؤ، لہٰذا اے مسلمانو! اُن میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ — خود مسلمان ہوکر — اللہ کے راستے میں ہجرت نہ کریں)۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے: {**ودّ كثير من أهل الكتاب لو يَرُدُّونكم من بعد إيمانكم كفاراً، حسداً من عند أنفسهم، من بعد ما تبين لهم الحق، فاعفوا واصفحوا حتى يأتي الله بأمره، إن الله على كل شيء قدير**} [البقرة: ۱۰۹] (بہت سے اہل کتاب حق واضح ہوجانے کے باوجود، صرف جلن اور حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد کسی طرح تم کو پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، تو تم معاف کرتے اور درگذر کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہی اپنا فیصلہ لے کر آئے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

بہر حال اِسلام دشمنوں کو تو کسی نہ کسی عنوان سے یہ سب کرتے ہی رہنا ہے، نہ اُن سے ہم کو کوئی شکایت ہے، اور نہ ہی کسی طرح کی امید اور توقع، جو اُن کو کرنا ہے وہ کر رہے ہیں، تشویش کی بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں جو ہم کو کرنا چاہیے تھا وہ ہم نہیں کر رہے ہیں، مسئلہ کو جس رخ سے سمجھنا چاہیے تھا اُس رخ سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ خطرناک بات ہوگئی ہے کہ اَب ہم ایسے حالات کے اَصل اسباب، اور حقیقی منشا کو ہی فراموش کرتے جارہے ہیں، مشکلات کے حل کی اصل تدابیر کو کوئی اہمیت بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

حالاں کہ اہل ایمان کے ہاں یہ بات طے شدہ تھی (اور اَب بھی ہے) کہ دنیا میں جو کچھ اچھا برا پیش آتا ہے وہ سب اللہ کے فیصلوں کے تابع، اور تقدیر کا حصہ ہے، بالخصوص مسلمان کو جو بھی مشکل حالات پیش آتے ہیں وہ کسی مخلوق کی طرف سے نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں، ظالم وجابر حکمراں بھی اللہ ہی کی طرف سے مسلط کیے جاتے ہیں، اور ساری حکمرانی اور اختیارات کے بعد بھی وہ اللہ کی ایک حقیر سی مخلوق ہوتے ہیں، اُن کے قلوب بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں سخت بنا دیتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں نرم فرما دیتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کو جو بھی مشکل حالات پیش آتے ہیں وہ یا تو بطور اِبتلا اور آزمائش کے ہوتے ہیں، یا بطور گناہوں کی سزا اور عذاب کے، اگر ابتلا وآزمائش کی صورت ہے تو اُس میں ہمت، استقامت، صبر اور تقوی کے ساتھ ساتھ، دعاؤں اور رجوع الی اللہ کا اہتمام کرنا چاہیے، اپنی عاجزی، کمزوری اور بے بسی اللہ کے سامنے پیش کرنی چاہیے، اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور دھرنا دینے کے بجائے، جائز اور ضروری تدابیر کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اُسی کی بارگاہ میں پڑنا چاہیے، تقدیر پر ایمان مضبوط رکھنا چاہیے، آخرت کے شاندار انعامات کے تصور کے ساتھ دل کو مطمئن رکھنا چاہیے۔

اور اگر گناہوں کی سزا کے طور پر مشکلات پیش آئی ہیں تو صبر اور تقوی کے ساتھ ساتھ، کثرت سے توبہ واستغفار کا بھی اہتمام کرنا چاہیے، گناہوں سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔

ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان اِس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ :

۱— کیا حق وباطل کی یہ معرکہ آرائی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آ رہی ہے؟ کیا اہل اسلام کو، اہلِ حق کو اِس سے پہلے مشکل حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟

۲— اگر سامنا کرنا پڑا تو اُس وقت کیا تدابیر اختیار کی گئی تھیں؟

۳- جو بھی تدابیر اختیار کی گئی تھیں وہ مفید اور کار آمد ثابت ہوئی تھیں یا نہیں؟

۴- فتنۂ تاتار میں اہل اسلام کن حالات سے گذرے؟ کس طرح گرے؟ پھر کیوں کر سنبھلے؟ کس طرح ڈوبے؟ اور پھر کیسے ابھرے؟

۵- بلکہ اس سے بھی بہت پہلے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی بقا، ترقی اور استحکام کی وہ کون سی تدابیر اختیار کی گئیں کہ صرف تیرہ سال کے مختصر سے عرصہ میں ''اولیاء الرحمن'' کی وہ جماعت تیار ہوگئی جس نے اگلے دس سالوں میں دنیا کا منظر نامہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا، عالمی سپر پاور (قیصر و کسری) کے تانے بانے بکھیر کے رکھ دیئے، مادی اسباب سے لیس اور ظاہری شان وشوکت سے آراستہ ''اولیاء الشیطان'' کی ساری تدابیر الٹی پڑتی گئیں، اور دنیا میں ایمان، تقوی، خداترسی، خلوص، محبت، سچائی، ہمدردی، اور دعوت الی اللہ کے جذبات سے لبریز ایک ایسی بے مثال حکومت قائم ہوگئی کہ جو آج بھی اہلِ انصاف اور اصحابِ نظر کے لیے معیار اور نمونہ ہے۔

ایک خدا کے ماننے والوں کو چاہیے کہ اپنے اُس مولیٰ کو راضی کرنے کی فکر میں رہیں جس کی طرف نسبت کی وجہ سے ہم کو یہ وقتی (اور بالکل وقتی) مشکلات درپیش ہیں، اور جس نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر ہم اُس کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلیں گے تو دین ودنیا کی کامیابیوں سے سرفراز ہوں گے، جیسا کہ ہم سے پہلے کے لوگ کامیاب ہو چکے ہیں: {**وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم في الأرض کما استخلف الذین من قبلھم، ولیمکنن لھم دینھم الذي ارتضی لھم، ولیبدلنھم من بعد خوفھم أمناً...**} [النور: ۵۵] (تم میں سے جو لوگ اِیمان لائیں اور نیک اعمال کریں اُن سے اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو زمین کی خلافت دے دیگا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو دی تھی، اور اُن کے لیے اُس دین کو ضرور اِقتدار بخشے گا جسے اُن کے لیے پسند کیا ہے، اور اُن کو جو خوف لاحق رہا ہے اُس کے بدلے اُنھیں ضرور اَمن عطا کرے گا...)۔

اِس کے برخلاف اگر ہم نے اُس کے بتائے ہوئے طریقہ سے اِعراض کیا تو اُس

کی طرف سے صاف اعلان ہے کہ پھر زندگی تلخ کردی جائے گی:{**من أعرض عن ذكري فإن له معيشةً ضنكاً**} [طه :۱۲۴] (اور جو میرے ذکر سے رُو گردانی کرے گا تو اُس کی زندگی بڑی تنگ ہو جائے گی)۔

ہمارے لیے یہ بڑی محرومی اور دونوں جہان کے خسارے کی بات ہے کہ ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے ساری تدابیر کے لیے تیار ہیں، نہیں تیار ہیں تو صرف اُن تدابیر کے لیے جو اللہ ورسول کی طرف سے براہِ راست ہم کو بتلائی گئی ہیں، اور جن کا بحیثیت مسلمان کے بار بار کامیاب تجربہ ہو چکا ہے، جن کو اختیار کرکے مسلمان بارہا حالات کے سخت گرداب سے نکل چکے ہیں، وہ تدابیر نہ کسی فقیہ کی بیان کی ہوئی ہیں کہ اُن کو مولویوں کی خانہ ساز کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے، نہ کسی امام کی مستنبط کی ہوئی ہیں کہ اُن کو مسلکی رنگ دے کر چھوڑ دیا جائے، نہ اُن میں کسی مفکر کے خیالات کا دخل ہے کہ اُن کو ذاتی رائے قرار دے دیا جائے، اور نہ ہی کسی متکلم اور فلسفی کے نظریات کی شمولیت ہے کہ سائنس کے دور میں اُن کو فرسودہ سمجھ لیا جائے۔

وہ تو اللہ کی بتائی ہوئی تدابیر ہیں جس کا کلام ازلی ہے، ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے تیر بہدف، وہ تو قرآن میں وارد تدابیر ہیں جس کا قانون ابدی ہے، ہر طرح کے حالات کے لیے مشکل کشا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی تدابیر ہیں جو قیامت تک لیے اُسوۂ حسنہ اور تمام انسانیت کے لیے نجات دہندہ، وہ احادیث میں بیان کی گئی تدابیر ہیں جو ہر مسلمان کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور ہر مومن کے لیے نورِ بصیرت۔

ذیل میں دشمنوں کی طرف سے مسلط کردہ ہر طرح کی مشکلات سے نکلنے کے لیے، اور کسی بھی آڑے وقت میں غیبی مدد کے استحقاق کے لیے قرآن وحدیث میں منصوص بعض اہم تدابیر کو قدرے اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، وباللہ التوفیق، وہو المستعان:　　(باقی آئندہ)

مسلمانوں کی ترقی کے اہم اور بنیادی اَسباب

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

مسلمانوں کی ترقی کے اہم اور بنیادی اَسباب:

سب سے پہلے ہم لوگوں کو اپنا یہ فکر و عقیدہ درست، مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے کہ اِسلام کی بنیاد ''مادیت'' کے بجائے ''روحانیت'' پر رکھی گئی ہے، یہاں کامیابی وناکامی کا مدار: ظاہری اَسباب وتدابیر سے پہلے، روحانی اَعمال واَشغال پر رکھا گیا ہے، ایک مسلمان کی کسی بھی کوشش اور تدبیر میں برکت اور تاثیر اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اُس کے پیچھے عقیدہ کی صفائی اور پختگی، عمل کی پاکیزگی اور درستگی، کردار کی شفافیت اور بلندی کی پشت پناہی بھی موجود ہو۔

تقدیر پر ایمان کی اہمیت:

ایک سچے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول پر، قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں پر، فرشتوں اور غیب کی باتوں پر، قیامت اور آخرت پر، اور اِن سب کے ساتھ بطور خاص ''تقدیر'' پر کامل اِیمان اور مکمل بھروسہ رکھتا ہو، اُس کا یہ پختہ یقین ہو کہ دنیا میں جو کچھ بھی خیر وشر پیش آتا ہے وہ ایک طے شدہ تکوینی نظام کے تحت ہوتا ہے، اِس لیے نہ تو کسی نعمت اور کامیابی پر حد سے زیادہ اِترانے کا موقع ہے، اور نہ ہی کسی مصیبت اور مشکل پر مایوس ہونے کی ضرورت ہے: {ما أصاب من مصيبة في الأرض ولا في أنفسكم إلا في كتاب من قبل أن نبرأها, إن ذلک علی اللہ يسير, لكيلا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم} (الحدید: ۲۲۔۲۳)

(جو مصیبت دنیا میں آتی ہے، یا خاص تم کو پیش آتی ہے وہ سب تمہاری پیدائش سے پہلے ہی ایک ''کتاب'' میں لکھی ہوئی ہے، اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے (علمِ غیب ہونے کی وجہ سے)، اور اِس بتانے کا مقصد یہ ہے کہ کسی نعمت کے فوت ہوجانے پر تم حد سے زیادہ رنج

بھی مت کیا کرو، اور کسی خوشی کے ملنے پر زیادہ اِترایا بھی مت کرو)۔

لہٰذا ایک مسلمان کو تقدیر پر بہت مضبوط ایمان رکھنا ضروری ہے، مؤمن کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اگر ساری دنیا مل کر بھی ہم کو کوئی نفع پہنچانا چاہے تو اُس وقت تک نہیں پہنچا سکتی جب تک ہماری تقدیر میں وہ بات لکھی ہوئی نہ ہو، اِسی طرح ساری دنیا مل کر بھی ہمارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، الا یہ کہ قسمت ہی میں اسی طرح لکھا ہوا ہو، اِس لیے ہم کو کسی بھی معاملہ میں نہ تو غیر اللہ سے کسی قسم کی توقع قائم کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی کسی طرح کا خوف اور مرعوبیت کا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ سارے اہلِ اقتدار، اربابِ حکومت، اور زور آور افراد و طبقات: اَحکم الحاکمین (تمام حکم رانوں کے حاکم اور شہنشاہ) کی نہایت معمولی اور حقیر سی مخلوق ہیں، ان کے ذریعہ کبھی تو وہ اپنے نیک بندوں کو آزماتے ہیں کہ اپنے دعویٔ ایمان و محبت میں سچے بھی ہیں یا نہیں؟: {ولنبلونکم حتی نعلم المجاهدین منکم والصابرین ونبلو أخبارکم} (محمد :۳۱) (اور یقیناً ہم تم کو آزمائیں گے تا کہ دیکھیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہیں اور کون ثابت قدم رہنے والے ہیں؟ اور تا کہ تمھارے (اطاعت و فرمانبرداری کے دیگر) حالات کو (بھی) جانچیں)۔

کبھی ان کے درجات کو بڑھانے کے لیے شر پسندوں کے ذریعہ کچھ ظاہری تکالیف میں مبتلا کر دیتے ہیں: {ونبلوکم بالشر والخیر فتنة وإلینا ترجعون} (الأنبیاء :۳۵) (اور ہم تم کو آزمائیں گے شر سے، بھی خیر سے بھی، اور ہماری ہی طرف تم کو لوٹ کر آنا ہے۔ لہذا اصل بدلہ وہیں ملے گا)۔

اور کبھی ہماری بداعمالیوں اور سرکشی کے نتیجہ میں بطور سزا اور عذاب کے بھی سخت دل حاکم اور ظالم حکم راں مسلط کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصے میں ہے: {فإذا جاء وعد أولاهما بعثنا علیکم عبادا لنا أولي بأس شدید فجاسوا خلال الدیار وکان وعداً مفعولاً} (الاسراء :۵) (کہ جب انھوں نے زمین میں سرکشی کی اور فساد پھیلایا تو ہم نے اپنے وعدے اور تہدید کے مطابق ان پر اپنے کچھ بندوں کو مسلط کر دیا، جو اُن کے علاقوں پر پوری طرح قابض ہو گئے، اور یہ ایک طے شدہ معاملہ تھا)۔

ایک اور جگہ اللہ کا ارشاد ہے: {وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها، فحق عليها القول فدمرناها تدميراً} (الاسراء: ۱۶) (اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوش حال لوگوں کو (اِیمان اور اِطاعت کا) حکم دیتے ہیں، پھر وہ نافرمانیاں کرتے ہیں، تو اُن پر حجت تمام ہوجاتی ہے، چنانچہ ہم انھیں تباہ و برباد کرڈالتے ہیں)۔

اِس کے برخلاف اللہ تعالی نے یہ وعدہ بھی فرمایا ہے کہ اگر لوگ ایمان لائیں اور تقوی اختیار کریں تو ہم اُن پر آسمان وزمین کی برکتوں کا دہانہ کھول دیں: {ولو أن أهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والأرض} (الاعراف: ۹۶)۔

حاصل یہ کہ بہر صورت اچھے برے تمام معاملات اور فیصلے اُدھر ہی سے طے پاتے ہیں، اِس لیے ہماری ساری امیدوں اور توقعات کا واحد مرکز، اور ہمارے سارے خوف اور خشیت کا واحد محور: اللہ سبحانہ وتعالی کی ذاتِ پاک ہونی چاہیے اور بس: ”لا ملجأ ولا منجى منك إلا إليك“ (اے ہمارے رب! آپ کے علاوہ نہ ہماری کوئی پناہ گاہ ہے، اور نہ ہی کوئی ذریعۂ نجات)، یہ صرف ایک دعا اور ذکر ہی نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان کا عقیدہ اور ہر مؤمن کا ایمان ہے۔

آج کل جو لوگ مسلمانوں کے دل میں غیر اللہ کا خوف بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، یا کسی اور سے امیدیں قائم کراتے اور توقعات وابستہ کراتے ہیں، وہ ہمارے ایمان کے لیے، ہمارے فکر و عقیدہ کی مضبوطی اور استحکام کے لیے سخت نقصاندہ اور انتہائی مضر ہیں، ایسے افراد اور طبقات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

توکل کی اہمیت:

اِسی طرح ”توکل“ بھی دِین کی اہم بنیادوں میں سے ہے، اور اُس کی حقیقت صرف اِتنی ہے کہ آدمی اپنا یہ عقیدہ بنالے کہ اَسباب چاہے جتنے بھی جمع ہوجائیں؛ مگر اللہ کی مشیئت، اُس کے اِرادہ، اُس کے اَمر اور اِذن کے بغیر کائنات کا ایک ذرّہ بھی ہِل نہیں سکتا، اِسی طرح اِس کے برعکس اَسباب کچھ بھی نہ ہوں، مگر اللہ تعالی کا حکم ہوجائے تو بے موسم کے پھل

بھی مہیا ہوسکتے ہیں، شعلہ برساتی آگ گل وگلزار بھی ہوسکتی ہے، طغیانی پر آمادہ دریا خاموشی سے راستہ بھی دے سکتا ہے، ابرہہ کے سرکش لشکر کو ابابیل جیسی معمولی چڑیا کے ذریعہ ہلاک بھی کیا جاسکتا ہے، اور بے سروسامان چھوٹی سی جماعت، بڑی سے بڑی سپر پاور طاقتوں کو شکستِ فاش بھی دے سکتی ہے: {قال الذين يظنون أنهم ملاقو الله كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة بإذن الله والله مع الصابرين} (سورۃ البقرۃ: ۲۴۹) (جن کو اللہ سے ملنے کا یقین تھا انھوں نے کہا کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بہت بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہیں)۔

دشمنوں کے ظلم وستم سے مقہور، حالات کی سختی اور شدت سے مجبور، مگر ''توکل'' کی پونجی کو محفوظ رکھنے والے اور صرف وصرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والے اپنے اولوا العزم بندوں کی ترجمانی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے: {وما لنا أن لا نتوكل على الله وقد هدانا سبلنا، ولنصبرن على ما آذيتمونا، وعلى الله فليتوكل المتوكلون، وقال الذين كفروا لرسلهم لنخرجنكم من أرضنا أو لتعودن في ملتنا، فأوحى إليهم ربهم لنهلكن الظالمين، ولنسكننكم الأرض من بعدهم، ذلك لمن خاف مقامي وخاف وعيدِ} [ابراہیم ۱۲:-۱۴]۔

(اور ہم کو کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر توکل نہ کریں، جب کہ اُسی نے ہم کو ہدایت دی ہے، اور ہم یقیناً صبر کریں گے تمھاری ایذاؤں اور تکلیفوں پر، اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے توکل کے دعوے داروں کو، اور کافروں نے ہمارے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمھیں اپنی زمین سے نکال دیں گے ورنہ تو ہمارے مذہب میں آجاؤ، تو اُن کے رب نے اُن (کو تسلی دیتے ہوئے، اُن) کی طرف وحی کی کہ ہم یقیناً ظالموں کو ہلاک کردیں گے، اور زمین میں اُن کے بجائے تمھیں بسا دیں گے، مگر یہ سب ہمارے وعدے اُن کے لیے ہیں جو میرے سامنے پیشی کا استحضار رکھتے ہوں، اور میری وعید اور عذاب سے ڈرتے ہوں — لہٰذا اصلاح وتقوی اختیار کرتے ہوں —)۔

حاصل یہ کہ ایک مؤمن کے لیے اللہ پر توکل اور اعتماد یہ بھی بہت بڑا سرمایہ اور غیر اللہ

کے خوف اور مرعوبیت سے نکلنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اِس لیے تقوی وطاعت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ اللہ کی قدرتِ کاملہ پر یقین پیدا کرنا کلیدِ کامرانی ہے۔

جائز تدبیر کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں

البتہ توکل کے ساتھ ساتھ جائز اور ضروری تدابیر اختیار کرنا بھی شریعت ہی کا حکم ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ''إن اللہ أنزل الداء والدواء، وجعلَ لکل داء دواء، فتداووا، ولا تداووا بالحرام'' (ابوداود ۲/۵۴۱) (کہ مرض اور علاج دونوں اللہ تعالی ہی نے پیدا کیے ہیں، اور ہر بیماری کی دوا بھی اتاری ہے، لہذا تم لوگ علاج اختیار کرو، مگر حرام طریقوں (اور دواؤں) سے نہیں)۔ لہذا ناجائز اسباب وتدابیر کا اختیار کرنا بہر حال ممنوع ہوگا خواہ مقصد کتنا ہی نیک ہو۔

اور جائز سبب: اگر (عادۃً) اُس کا نفع یا نقصان یقینی ہو، تو نفع کی صورت میں ایسے اسباب کا ترک کرنا جائز نہیں، جیسے کھانے سے آسودگی ہوجانا، یا پینے سے سیرابی ہوجانا، اور نقصان کی صورت میں اُس سے بچنا واجب ہے، جیسے آگ میں ہاتھ ڈال دینا، لہذا اگر کسی نے ایسے مفید اَسباب کو ترک کیا، یا ایسے مضر اسباب کو اختیار کیا، پھر اُس کو کوئی دینی یا دنیوی نقصان ہوگیا تو شرعاً گنہ گار ہوگا، ''تَسحَّروا''، ''تَزَوَّدُوا''، ''تَزَوَّجُوا'' وغیرہ شریعت کے اَوامر، اور صومِ وصال، صومِ سفر وغیرہ سے ممانعت کی یہی حکمت بتلائی گئی ہے۔

اور اگر وہ یقینی کے بجائے ''ظنی'' سبب ہو، اور نتیجہ زیادہ تر تو موافق ہوتا ہو، مگر بارہا خلاف بھی ہوجاتا ہو، جیسے علاج کے ذریعہ صحت ہوجانا، مزدوری نوکری کے ذریعہ روزی ملنا، وغیرہ، تو ایسے اسباب کا ترک کرنا صوفیہ کے یہاں ''توکّل'' کہلاتا ہے، یہ توکّل عام لوگوں کے لیے تو جائز نہیں، ہاں خواصِّ امت اور اہل اللہ کے لیے جائز ہے، بلکہ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ کسی قدر مستحب اور مؤکّد بھی۔

اور اگر وہ سبب: وہمی اسباب کی قبیل سے ہو، جن کو اہلِ حرص وطمع اختیار کرتے ہیں، اور جس کو شریعت میں ''طولِ امَل'' کہا جاتا ہے، تو ایسے اسباب کا ترک کرنا شریعت میں مطلوب اور محمود ہے، دیندار مسلمانوں کو اِن میں زیادہ نہ پڑنا چاہیے۔